R. No. 2180/57 Regd. No. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

جلد ۲۲ - شمارہ ۱ | ایڈیٹر - آل احمد سرور | علی گڑھ - یکم جنوری ۱۹۶۳ء

...یونیورسٹی میں اردو
...لیکچرار رعنا تیوموا

...میں اردو ادب کا مطالعہ کر رہی ہوں

ذیل کا مضمون رعنا تیوموا کا لکھا ہوا ہے جو تاشقند یونی ورسٹی میں اردو کی استاد ہیں۔ اور اردو کی مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے آج کل ہندوستان آئی ہوئی ہیں اور دہلی میں مقیم ہیں۔

اردو زبان و ادب سوویت یونین میں بہت پہلے، سوویت ... قائم ہونے کے پہلے سالوں ہی سے سیکھے جاتے ہیں۔ ... ماہر علوم ہند اکیڈیمیشن بارانیکوف کا نام ...ں بھی مشہور ہے۔ کیونکہ انھوں نے سوویت ...ہندوستانی زبانیں، ادب، تاریخ اور تہذیب کا ... میں بڑا پارٹ ادا کیا ہے۔ سال بہ سال اردو ...ب کے لئے دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کی وجہ ہے بھارت اور سوویت یونین کے درمیان اقتصادی اور تہذیبی تعاون کا بڑھنا۔ سوویت یونین میں علم ہند کے مرکز ماسکو، لینن گراڈ اور تاشقند ہیں۔ ان کی یونی ورسٹیوں میں اردو زبان و ادب کا مطالعہ کرنے والے علمی کارکن، مترجم، لیکچرار، معلم تیار کئے جاتے ہیں۔

مگر اردو زبان نہ صرف ان یونی ورسٹیوں میں پڑھائی جاتی ہے بلکہ ۱۹۵۸ء سے سوویت یونین کے بہت سے اسکولوں میں ہندی، اردو، عربی، فارسی وغیرہ زبانوں کی پڑھائی شروع کی گئی ہے۔ اردو زبان ماسکو، تاشقند، سمرقند، آلما آتا اور کئی ایک دوسرے شہروں میں سیکھی جاتی ہے۔

اس کا مقصد مشرقی زبانیں اچھی طرح سے جاننے والے لوگوں کو تیار کرنا ہے کیوں کہ بچے بڑوں سے زیادہ جلد ہی دوسری زبانیں سیکھ لیتے ہیں۔ اسکول کے آخری سالوں میں وہ کئی ایک مضامین (تاریخ، ادب، جغرافیہ وغیرہ) اردو ہی میں پڑھیں گے۔ تاشقند یونی ورسٹی کے لیکچراروں کے ایک گروپ نے، جس میں میں بھی شامل ہوں، سوویت یونین کے اسکولی بچوں کے لئے اردو درسی کتابیں تیار کیں۔ جن کا پہلا مقصد ہے بچوں کو اردو بول چال سکھانا۔ بھارت سے آئے ہوئے مہمان جب ان بچوں سے ملتے ہیں جو مشرقی زبانیں سیکھ رہے ہیں، تو بہت خوش ہوتے ہیں۔

اردو ادب اور زبان کے گہرے علمی مطالعہ کا مرکز سوویت یونین کی اکاڈمی آف سائنس ہے۔ اس کے مختلف شعبوں میں اور ازبیک ری پبلک کی اکاڈمی آف سائنس میں اردو زبان و ادب کے قسم قسم کے مسائل پر علمی تحقیق کی جاتی ہے۔ مثلاً اردو نثر کی پیدائش اور اردو ناول نگاری کے بارے میں ماسکو کے اکاڈمی آف سائنس کے ایک کارکن سوخوچیف ایک کتاب تیار کر رہے ہیں۔ گلیبوف کئی ایک سال سے نظیر اکبرآبادی کی تصانیف پر ایک تحقیقی مقالہ تیار کر رہے ہیں۔ مشہور شاعر غالب کی شاعری اور ان کے خطوط کے بارے میں تاجکستان کے پوسٹ گریجویٹ پولاتوا اور غفاروف تحقیقی مقالے لکھ چکے ہیں۔ عصمت چغتائی اور خواجہ احمد عباس کے بارے میں ازبکستان کے پوسٹ گریجویٹ مضامین تیار کر رہے ہیں۔ میرے مقالے کا موضوع "کرشن چندر کے ناول اور ناولٹ" ہے۔ ابھی حال ہی میں میں نے ان کا نیا ناول "ایک عورت ہزار دیوانے" روسی زبان میں ترجمہ کیا تھا اور یہ ہمارے قارئین کو بہت پسند آیا۔

(باقی صفحہ پر)

جاوید نہال

قصہ پرتھی راج کا

"قصہ پرتھی راج کا" میر عباس علی کی تالیف ہے۔ میر عباس علی نے اپنے مربی اور سرپرست نواب محمد خاں بہادر دلاور فواز جنگ کی فرمایش پر بھاکا سے اُردو میں لکھا تھا۔ اس قصے میں پرتھی راج چوہان کی شجاعت، مردانگی، بے خوفی اور عجوبہ کارناموں کا حال افسانوی رنگ میں بیان کیا گیا ہے۔ واقعات اور مہمات تاریخ سے بالکل جُدا معلوم ہوتی ہیں۔ واقعات کی صحت کا بھی کچھ لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ جے چند والی قنوج، پرتھی راج کی مخاصمت اور شہاب الدین غوری کے ساتھ پرتھی راج کی لڑائیوں کا حال بھی مختلف ہے۔ اس قصے کے خالق نے تصرف سے کام لے کر، عجیب عجیب واقعات کی تخلیق کی ہے، اور اس قصے میں دل چسپی اور شدت پیدا کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ میر عباس علی نے اُردو قصے کو ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۴ء میں ترتیب دیا تھا۔ یہ بھاکا قصے کا ترجمہ ہے، لیکن عباس نے یہ نہیں لکھا ہے کہ بھاکا کس کی تصنیف ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ پرتھی راج راسا کا ترجمہ ہو۔ میر عباس نے جس وقت اس قصے کو اُردو کا لباس پہنایا تھا، اس وقت اُردو نثر کا ابتدائی دور تھا لہٰذا اس نیم تاریخی قصے کو اُردو ادب میں تھوڑی بہت اہمیت ضرور حاصل ہے، اور اس کی افادیت سے انکار کی گنجائش بھی نہیں، اس کے مطالعے سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے داستان گوشتیوں کی داستان نگاری شمالی ہند میں کس قدر مقبول ہوئی تھی، اور وہاں بھی فورٹ ولیم کالج کا اثر بھرپور ہوا تھا، اور اس کالج میں مرتبہ داستانوں کی طرح شمالی ہند میں بھی قصے آسان زبان میں لکھے یا ترجمہ کیے جاتے تھے، اور وہاں کے جاگیردار، نواب اور زمیندار داستان گوؤں کی سرپرستی اور خاطر خواہ حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے۔

پرتھی راج کا قصہ دوسری نثری داستانوں جیسا ہے، اس کے مؤلف اور مترجم نے دیباچہ میں حمد خدا، نعت رسول اور منقبت علیؓ کے بعد سبب تالیف کے علاوہ اپنا حال بھی اختصار سے لکھا ہے۔

"میر عباس علی کہ علم شاعری اور منشی گری میں موافق حوصلہ ناقص اپنے مہارت رکھتا تھا اور شیریں ہی سے ذوق نظم لکھنے کی کہ عبارت فصیح اور شُستہ اور عمق و توفیق اور رقاع اور نستعلیق اور شفیعہ اور آمیز اور شکستہ سے ہے ... متہاے لکھتا، ہنر قزاقوں کی تہذیب کا یادواد کتابوں کی طلاکاری کے فن میں بقدر استعداد استاد تھا فضل خدا سے سایہ میں پدر بزرگوار کے گزر اوقات بخوبی کرتا اور چشم توقع کی بجز واہب بے منت کے کسی پر نہیں دھرتا۔

جب تقدیر الٰہی سے وہ سایہ بلند سمت لڑکپن میں ڈھل گیا۔ اس وقت عمر کے بیس برس کی راہ سے نکل گیا۔ آٹھ برس کے عرصے میں قریب دس ہزار روپے کے زیور و نقد و جنس و اسباب گھر تلف ہوا، گویا تھا یا نہ تھا۔ مثل مشہور مال آتا جیش آتا۔ پھر تو نرا قلاش اور نپٹ تنگ معاش ہو رہا۔ جب چند روز گذرے موافق آیت شریف ان مع العسر یسرا کے بعد سختی تکلیف کے راحت ہے مسبب الاسباب نے سبب کر دیا، یعنی نواب قدسی القاب شیر پیکر رستم دل، دوست نواز، دشمن گسل ... صاحبان عزم جزم فتح نصیب میدان رزم کے امیروں کا تاج سر سرداروں میں صاحب لشکر، زور بدرسانے والا علم داروں پر، دولت آصفی کا رکن ... سپہ داری کے دریا کا نہنگ نواب محمد خاں بہادر دلاور فواز جنگ۔ ابیات

خدایا اسے حشر تک شاد رکھ — اور اولاد کو اور اس کی آباد رکھ
دل و جسے سب کچھ اس کے نزدیک فکر — خدا اور محمد کا ہو اس کو ذکر

....

دعا بعد عباس پہنچائے تو ہاتھ ہو — دعا مانگ کر ختم ابیات کو

نہایت جاہ اور پرورش کرنے کی راہ سے اپنے حضور میں بُلا کر آفتاب کی طرح اس ذرّہ ناچیز پر سایہ مہر کا ڈالا اور درماہے معقول سے سربلندی بخشا (بخشی)۔ جب فکر اس خداوند نعمت کے ہاتھ سے نہ نقد پانے اور نعمتیں کھانے سے دور ہوئی اور پیالہ دل خوشی کی شراب سے بھرپور ہوا تب بے فکری کے خمار میں نہایت سرمستانہ فراغت کے نشہ سرشار میں ملایق سے بیکیفہ کم و راست پایا۔ خاطر مبارک میں لایا کہ کہیں شادی مرگ نہ ہووے حکمت عملی سے واسطے لاحق ہونے فکر کے اور دب جانے جوش خون کے ارشاد فرمایا کہ قدیم سے ایک قصہ پرتھی راج کا بھاکا زبان میں ہے کہ زبان سے ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آتا اور بالکل ذہن نشین نہیں ہوتا اس کو زبان اُردو میں نہایت فصاحت سے لکھ کر ہماری نظر کیمیا اثر میں لاؤ۔ اس محنت شاقہ کے بدلے میں انعام پائے گا، اور ماہ بماہ عشرے کو رنگ دلیاں سنائے گا۔ موافق حکم اپنے خداوند کے کہ نیم خدا اس کو کہتے ہیں، ان کے حکم کو اوپر ادب کے مقدم جان کر واسطے بنانے اس کتاب کے خون جگر کھایا، انعام کے لالچ میں اپنے بدن کا لہو دھو دھو سکھایا اور بارے مشاطہ طبیعت نے اس قصے کی دلہن کو لباس اُردو زبان کا پہنایا اور زیور نظم سے سنوار باطن کے چھپر کھٹ سے تخت ظاہر پر جلوہ دیا تا برکت سے سورہ اخلاص کی نواب ملک، تا ب دل کی مطلوب اور دیکھنے والوں کے مزاجوں کی مرغوب ہو

**وقت کام کا ہے،
باتوں کا نہیں**

ہماری زبان

یکم جنوری ۱۹۶۳ء

نیا سال

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے (اقبال)

پہلی جنوری سے جو نیا سال شروع ہوتا ہے وہ نہ ہندوؤں کا ہے نہ مسلمانوں کا، مگر اب ساری دنیا کا ہو گیا ہے اور اس لئے ہمارا بھی ہے۔ وقت کے سمندر میں ایک سال ایک قطرہ ہے، مگر جس طرح قطرے سے دریا کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اسی طرح ایک سال سے بھی اپنی رفتار کے متعلق کچھ رائے تو قائم کی ہی جا سکتی ہے۔ اس وقت ہماری مراد صرف اُردو تحریک کی رفتار سے نہیں، بلکہ ملک کی رفتار سے ہے جس کو سامنے رکھ کر اُردو کی ترقی کی رفتار کے متعلق بھی اظہار خیال کیا جا سکتا ہے۔

ہمارے ملک کو آزاد ہوئے ساڑھے پندرہ برس ہونے کو آئے۔ اس عرصے میں ہم نے اپنا دستور بنایا، ملک کو سکولرزم کے اصولوں پر چلنا سکھایا، ایک جمہوریت کی بنیاد ڈالی اور اُن بنیادوں کو مضبوط کرنے میں لگے رہے۔ دو پنج سالہ منصوبے پورے کئے اور تیسرے میں قدم رکھا۔ سوشلزم کو منزل مقصود قرار دے کر اُس کی طرف قدم تیزی سے بڑھانے لگے۔ ملک میں صنعتی پروگرام شروع کئے۔ دریاؤں پر بند باندھے اور پانی کی اُس طاقت سے جو بیکار جاتی تھی بجلی بھی حاصل کی اور پیداوار میں بھی اضافہ کیا۔ خواندگی کی شرح بڑھائی اور اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور صنعتی اداروں کی تعداد کو ترقی دی۔ دنیا کو امن کا پیغام دیا۔ کچلے ہوئے اور غلام ملکوں کی آزادی کے لئے اقوام عالم کے سامنے آواز بلند کی۔ جنگ کی مذمت کی۔ ملک میں فنون لطیفہ کا احیا ہوا، قومی زبانوں کی ترقی کے لئے راہیں نکالی گئیں۔ ہندوستان کو دوسرے ملک عزت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ صدیوں کی غلامی اور پستی کے بعد ہندوستان کو سربلندی حاصل ہوئی۔

ان سب باتوں کے باوجود، ہم اُتنی ترقی نہ کر سکے جتنی ہم کو کرنی چاہئے تھی۔ ہم نے قوم کو وہ یکجہتی نہیں سکھائی جو اس میں ہونی چاہئے تھی۔ اقلیتوں کے ساتھ باوجود اچھے ارادوں کے وہ سلوک عام طور پر نہیں کیا جو ہمارے دستور کی رو سے اُن کا حق تھا اور جو ہمارے رہنما چاہتے تھے۔ سب قومی زبانوں کی یکساں ترقی کے دعوے تو بہت ہوئے مگر کچھ دشواریوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ اُردو کی قومی حیثیت کا سب نے اعتراف کیا اُس کے حقوق کا پاس کم لوگوں نے کیا۔ ذات پات، صوبجاتی اختلافات، لسانی پاسداریوں سے ہم بلند نہ ہو سکے۔ ہم نے دنیا کو اور اُس کی رفتار کو غور سے نہیں دیکھا۔ ہم نے اپنی فوجی طاقت مضبوط نہیں کی اور چین کی باتوں میں آ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چین نے دوستی کی آڑ میں دشمنی کی، ہماری سرحدوں پر حملہ کر دیا۔ ہمارے ملک کی سالمیت مجروح ہوئی۔ ہمارے جوان مارے بھی گئے اور گرفتار بھی ہوئے اور زخمی بھی۔ نہ صرف ہماری سالمیت پر حملہ ہوا، بلکہ ہماری ذلت بھی ہوئی۔ ہمیں اس ذلت کے داغ کو دھونا ہے۔ ہمیں ملک کی سالمیت کو ہر طرح محفوظ کرنا ہے۔ ہمیں نہ صرف فوجی تیاری کرنی ہے بلکہ پورے ملک میں ایک ایسا جوش اور جذبہ پیدا کرنا ہے کہ ہر فرد اس وقت قومی مفاد کو ہر چیز پر ترجیح دے اور ذہنی اور مادّی حیثیت سے ملک کو اتنا مضبوط بنا دے کہ کوئی ہماری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھ سکے۔ یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہئے کہ لڑائی صرف فوجوں سے لڑی جاتی ہے۔ فوجیں تو صرف ہتھیار ہیں۔ ہتھیار جس ہاتھ میں ہے وہ مضبوط ہونا چاہئے اور ہاتھ کی مضبوطی میں ذہن کی مضبوطی کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ ع ، تلوار کاٹتی ہے مگر ہاتھ چاہئے۔ یہ ہاتھ قوم کے تمام افراد ہی فراہم کر سکتے ہیں۔ سنہ ۱۹۶۲ء ہمارے لئے بڑی عبرت اور بصیرت رکھتا ہے۔ یہ ہماری غفلت کا سال تھا۔ امید ہے کہ ۱۹۶۳ء ہماری بیداری کا سال ہوگا۔ آثار اچھے ہیں۔ عوام میں اس وقت خاصی بیداری ہے۔ مگر اس بیداری سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے روز مرّہ کے کاموں کو خوش اسلوبی سے چلانا اور اُن کے ساتھ ملک کی سب سے بڑی ضرورت یعنی آزادی کی حفاظت کا بھی حق ادا کرنا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے کا کام جاری رہے گا۔ اُردو کی بقا اور ترقی کے لئے ہماری کوششیں بھی جاری رہیں گی۔ مگر اس طرح کہ وقت کی سب سے بڑی ضرورت یعنی ملک کی یکجہتی، مضبوطی اور کارکردگی برابر بڑھتی رہے۔ ہمارا مشن بلند ہے، ہماری صلاحیتیں بے پایاں ہیں، ہمیں اب عمل کے میدان میں سُرخرو ہونا ہے۔ جس کا نصب العین بلند ہوتا ہے اُس کی ذمّے داری بھی زیادہ ہوتی ہے۔ ہمالہ کی پاسبانی کے لئے ہمالہ کا سا عزم درکار ہے۔

اقبال کرشن

امجد علی اشہری

(۵ نومبر کے 'ہماری زبان' میں عابد رضا بیدار صاحب کا مضمون "یہ چند ہم عصر" شائع ہوا ہے جو امجد علی اشہری کی "ایشیائی شاعری" سے ماخوذ ہے۔ اب مجھے امجد علی اشہری کی ایک دوسری کتاب ملی جو بوسیدہ حالت میں ہے۔ اس میں سنہ تالیف وغیرہ کہیں درج نہیں۔ یہ شروع میں جو دیباچہ اشہری نے لکھا ہے وہ میں یہاں نقل کر رہا ہوں — ا۔ک)

دیباچہ

میں ریاست بھوپال میں بائیس برس تک عہدہ ہائے نائب میرافعہ و مستغنی کونسل چیف سکریٹری ۔۔۔ پر مامور رہا۔ کئی رسالے اور اخبار میرے ہاتھ میں رہے۔ میں نے فارسی اور اردو میں چھبیس بائیس کتابیں لکھیں۔ اُن میں سے گیارہ کتابیں مختلف مطبعوں میں طبع ہوئیں قدردانوں نے قدردانی فرمائی۔ ۔۔۔ نے قبولیت سے دیکھا۔ بعض کتابوں کے دو دو تین تین ایڈیشن شائع ہوئے۔ علیا حضرت ملکہ معظمہ کوئن وکٹوریہ سابق قیصرۂ ہندوستان و انگلستان کی رحلت پر حضور ممدوحہ کے عہد ۔۔۔ یادگاری واقعات کی کتاب لکھی۔ ۔۔۔ اعلیٰ حضرت ایڈورڈ ہفتم قیصر ہندوستان و انگلستان کی تاج پوشی کا مرقع مدون کیا جو مطبع آگرہ اخبار میں طبع ہوا۔ علیا حضرت نواب شاہ جہاں بیگم صاحبہ کرون آف انڈیا و نائٹ گرانڈ کمانڈر اسٹار آف انڈیا سابق رئیسہ بھوپال ارم آرام نے بعض تصنیفات کے صلہ میں پانچ پانچ اور آٹھ آٹھ سو روپے مرحمت فرمائے۔

ہز اکسلنسی سر آسمان جاہ بہادر امیر اکبر و مدار المہام سابق حیدرآباد نے خاص قدردانی کا اظہار فرمایا۔ ہز اکسلنسی نواب سر وقار الامراء بہادر نے ایک مسدس پر پانسو روپے مرحمت کئے۔

عالی جناب منشی امتیاز علی خاں صاحب بہادر سابق وزیر ریاست بھوپال نے نوسو روپے کے عطیہ سے ممتاز کیا۔

عالی جناب نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی خاں صاحب بہادر آنریری سکریٹری مدرسۃ العلوم علی گڑھ اور جناب مولوی سید علی حسن صاحب سابق رکن مالگذاری حیدرآباد حال ممبر کونسل ریاست اندور سنٹرل انڈیا کو میری جانب خاص التفات رہا۔ اخباری دنیا کا خاص شکرگذار ہوں جو میری عزت افزائی کرتی ہے۔

اب کہ حضور شاہزادہ عالم و عالمیان پرنس آف ویلس بہادر ہندوستان میں تشریف لائے اور ایسے موقعوں پر ایشیائی مذاق کا عام دستور ہے کہ جو جس لائق ہوتا ہے وہ نذر و پیش کش کا سامان کرتا ہے اور تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ کتاب سے بہتر کوئی ہدیہ و یادگار نہیں۔ گذشتہ بادشاہوں اور شاہزادوں کے نام نامی سے بھی کتابوں کو معنون کیا گیا ہے۔ اس خیال سے میں نے بھی اپنی مختلف نظموں کی پھول پتیاں لے کر یہ گلدستہ بنایا، جس کو حضور ممدوح کے نام نامی سے معنون کرتا ہوں۔

راقم
سید امجد علی اشہری

پوری کتاب چوبیس صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں مختلف عنوانات کے تحت کچھ نظمیں وغیرہ ہیں۔ عنوانات لکھے دیتا ہوں۔ رباعیات معرفت، مثنوی علت العلل خدا کا نور، مسدس، خدا کی معرفت، نیچرل فلاسفی، نیچرل سائنس، قل الروح من امر ربی، آفتاب عالم تاب، آگ، ہوا، پانی، زمین، زمین کا پیدا ہونا، حکمائے قدیم کا خیال، زنو فاجر حکیم یونان کی زبانی، حکیم فیثا غورث کا خیال، حکیم اور ستا غریبی سی اوڈ کا خیال، حکیم برنیٹ کی بلند پروازی۔

(ا۔ک)

ادبی حلقہ انجمن ترقی اُردو (ہند)

شرائط رکنیت ادبی حلقہ

حلقے کی رکنیت کی فیس سالانہ تیس روپے یک مشت، یا دس دس کی سہ ماہی قسطوں میں۔

حلقہ ممبروں کو ہر سال پچیس روپے کی کتابیں اور انجمن کا سہ ماہی رسالہ "اردو ادب" قیمتی دس روپے کا، اور انجمن کا ہفتہ وار اخبار "ہماری زبان" قیمتی تین روپے، کل اڑتیس روپے کی مطبوعات پیش کرے گا۔

ارکان کو بقدر پچیس روپے انجمن کی مطبوعات میں سے اپنی پسند کی کتابیں منتخب کرنے کا حق ہوگا۔ محصول ڈاک رکن کے ذمہ ہوگا۔ تیس روپے کے عوض اڑتیس روپے کی مطبوعات مندرجہ بالا صورت میں دی جائیں گی۔ اس کے علاوہ اگر کوئی رکن انجمن کی دوسری کتابیں خریدے گا تو پچیس فی صد کمیشن دیا جائے گا۔ مزید تفصیلات کے لئے دفتر سے خط کتابت کیجئے۔

ادبی حلقہ انجمن ترقی اردو ہند۔ علی گڑھ

نیا سال ۱۹۶۳ء

(۱)

اسعدؔ اکبرآبادی

پہلے امبر سے مستی میں گاتا ہوا
گل لٹاتا ہوا
مسکراتا ہوا
آج کی شب زمیں پر کوئی آئے گا
غم چلے جائیں گے
غم زدہ گائیں گے
ہر طرف کیف ہی کیف چھا جائے گا
آج کی شب زمیں پر کوئی آئے گا

دور ساحل پہ پریاں اُترنے لگیں
شوخ لہریں مچل کر اُبھرنے لگیں
روشنی کے کنول
رقص کرنے لگے
زندگی میں مری
رنگ بھرنے لگے
ڈھل گئی ہے فضا عطر میں ڈوب کر
آج کی شب زمیں پر کوئی آئے گا

آگ پھولوں کے دل میں بھڑکنے لگی
خوشبوؤں کی بھی چھاتی دھڑکنے لگی
مہکا مہکا چمن
لہلہانے لگا
بہکا بہکا پون
گنگنانے لگا
لو وہ چرچوں کے گھنٹے بھی بجنے لگے
جام چلنے لگے
دل مچلنے لگے
تو بھی ماضی کی سب کلفتیں بھول جا
آج کی شب زمیں پر کوئی آئے گا

(۲)

رحمان ساجد

دیکھتے ہی دیکھتے پھر آ گیا ہے سالِ نو

اس طرح گذری ہے مدت جیسے کل کی بات ہے
آج بھی آنکھوں کے آگے وہ سنہری رات ہے
جشنِ سالِ نو کی ہمدم! منعقد تقریب تھی
ماہِ کامل سے بھی بارش ہو رہی تھی نور کی

تھے جمع احباب سارے باہزاراں انبساط
ایک ہنگامہ بپا تھا، گرم تھی بزمِ نشاط
جل رہے تھے ہر نگہ میں عزم و ہمت کے چراغ
یعنی آنکھیں تھیں کہ گویا منزلوں کا تھا سراغ
ولولے رقصاں دلوں میں آرزوئیں بے قرار
جیسے ہو جائیں گے پل میں منزلوں سے ہم کنار
الغرض ہر شخص نے وہ پُرفسوں تقریر کی
دم کے دم میں ہو گئیں حل گتھیاں تدبیر کی
آنے والے اک سنہرے خوبصورت دور کی
کھینچ دی آنکھوں کے آگے اک نئی تصویر بھی

لیکن ہمدم وہ عزائم آہ! منصوبے تمام
ناشناسائے عمل تھے، صورتِ سودائے خام

پے بہ پے شام و سحر آتے رہے جاتے رہے
زندگی کا راز اپنی لے میں سمجھاتے رہے
دن مہینے بن کے اپنی منزلیں پاتے رہے
ہر خیالِ خام سے ہم دل کو بہلاتے رہے

اور مہینوں سے بالآخر ہو گیا جب ایک سال
آ گیا ناگاہ اپنے خوابِ غفلت کا خیال
کھنچ گیا آنکھوں کے آگے آہ اک تاریک جال
ہاتھ ہم ملنے لگے باحسرت و رنج و ملال

ڈر رہا ہوں میں کہیں اس سال بھی ایسا نہ
دیکھتے ہی دیکھتے پھر آ گیا ہے سال

رزمیہ

محمد منشاءالرحمٰن خاں منشاؔ

سراپا جذبۂ پیکار بن جانا بھی آتا ہے — ہمیں گل ہی نہیں تلوار بن جانا بھی آتا ہے
ستم کی آندھیاں سمتِ چمن جب چلنے لگتی ہیں — تو ہم کو آہنی دیوار بن جانا بھی آتا ہے
کوئی برسے تو گل ریزی ہمارا جزوِ فطرت ہے — کوئی چھیڑے تو آتش بار بن جانا بھی آتا ہے
نہ دیکھے خواب بھی کوئی ہماری پائمالی کا — ہمیں غارت گرِ پندار بن جانا بھی آتا ہے

جو نغمہ بن کے منشاؔ بزم کو مسرور کرتی ہے
اُسی آواز کو للکار بن جانا بھی آتا ہے

تمنا سہسرامی

اخگر سہسرامی

سہسرام، نہ صرف شیر شاہ اور ہیمو بقال جیسے اولوالعزم حکمرانوں اور مبارز طلب شخصیتوں کے مدفن اور مولد کا فخر رکھتا ہے بلکہ علماء، فضلاء اور شعراء کی بڑی بڑی ہستیاں بھی اس تاریخی سنگلاخ سرزمین سے اکثر اُبھرتی رہیں جن میں بعض شعراء وہ حیثیت شاعرانہ رکھتے ہیں کہ ان پہ سہسرام کیا بہار کو ناز ہے۔ ان مایہ ناز شعرائے کرام میں سید الشعراء جناب سید شاہ امیر عالم صاحب اخگر سہسرامی کا نام نامی بھی آتا ہے، جو بغیر کسی خواہش نام و نمود کے آخری عمر تک اُردو شعر و ادب کی خدمت کرنی اپنا فرض اولین سمجھتے تھے۔

وہ اپنے کلام کی بابت خود رائے ظاہر کرتے ہیں کہ ؎

فصاحت کی لو داد اخگر انھیں سے
جو کہتے ہیں اُردو ہماری زبان ہے

اخگر ۱۸۹۰ء میں ایک باعزت، شریف اور عالی خاندان میں پیدا ہوئے۔ دستور زمانہ کے مطابق ابتدائی تعلیم عربی اور فارسی کی حاصل کی اس کے بعد مقامی ہائی انگلش اسکول سے امتیازی نمبر سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ پھر اعلیٰ انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لئے سینٹ زیویر کالج کلکتہ میں داخلہ لیا لیکن انقلاب زمانہ نے انھیں آئی۔اے۔ کے امتحان میں شریک ہونے اور آگے پڑھنے کی اجازت نہ دی۔

اخگر کی طبیعت شعر و شاعری کی طرف شروع ہی سے راغب تھی۔ اُردو ادب کی ترقی کو اپنی زندگی کا مقصد اعظم اور مطمح نگاہ سمجھتے تھے۔ فطرت، ماحول اور ادبی ذوق نے انھیں بہت جلد شاعری کی شاہراہ پہ گامزن کیا۔ سونے پہ سہاگہ، حضرت مولانا عبدالاحد شمشاد لکھنوی سا استاد پایا جن کے فیوض و اصلاح سے بہرہ ور ہوئے اور صاحب کمال نے اپنے فیض سے اخگر کو اپنے عہد کا ایک باکمال شاعر بنایا۔ اخگر خود اس کا اقبال کرتے ہیں ؎

فیوض حضرت شمشاد میں اب اخگر بھی
شریک مجمع اہل کمال ہوتا ہے

اخگر نے شاعری کو نہ تو ذریعۂ عزت بنایا نہ وجہ معاش بلکہ اس سے اُردو ادب کی خدمت انجام دی۔ وہ ایک زندہ دل شاعر تھے جو نہایت آزادی سے روزمرہ اور آسان لفظوں میں اپنے خیالات کو پیش کرتے تھے۔

مثال کے طور پر مخمس کے دو بند ملاحظہ ہوں:-

ساقی سے فروش نے یارانہ ہوگیا
اپنی شراب اپنا ہی مے خانہ ہوگیا
دن رات شغل شیشہ و پیمانہ ہوگیا
دل میرا مست نرگس مستانہ ہوگیا
میں آج دو ہی جام میں دیوانہ ہوگیا

بھتی کی شرط جام پرستوں کے واسطے
آزادیاں ہیں بادہ پرستوں کے واسطے
مجبور کیوں ہوں خاص نشستوں کے واسطے
قید مکاں نہیں ترے مستوں کے واسطے
ڈھلنے لگی جہاں وہیں مے خانہ ہوگیا

اخگر کی سخن پرور طبیعت نے اسے اپنے ہم عصر عالمگیر شاعر اعظم ڈاکٹر اقبال کے طرز سخن پر بھی مائل کیا۔ ملاحظہ ہو ؎

مسلم خوابیدہ اُٹھ خواب غفلت کب تلک
خود فراموشی کہاں تک ذوق راحت کب تلک
مبتلائے مے پرستی محو عشرت تا کجے
آخرش کب تک سہے گا اور مصیبت تا کجے
اُٹھ دکھا دے زور و طاقت دشمن چالاک کو
اور نعروں سے ہلا دے گنبد افلاک کو

اخگر کی شاعری تغزل کے اعتبار سے خاص اہمیت رکھتی ہے آپ کا کلام زبان کی سادگی، تخیل کی بلندی اور جذبات کی لطافت کا آئینہ دار ہے جس میں آورد کے بجائے آمد کی جلوہ گری ہے۔ حیف کہ آپ کے بہت سارے کلام ضائع ہوگئے کچھ مختلف گلدستوں اور رسالوں سے فراہم ہو سکے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:-

نکل رہے ہیں مرے دل سے بے طرح اخگر
قفس کی آج جلاؤں کا تیلیاں صیاد

تیر ہی پیاسے اگر خون دل دلگیر کے
ہم بھی ہیں تشنہ دہن آب دم شمشیر کے

آب دم شمشیر میں جو لطف ہے اخگر
پائی ہے لطافت یہ کہاں آب بقا نے

ہو کیوں نہ ایک دم میں مسافت عدم کی طے
ہم ہیں سوار ابلق لیل و نہار پر

جو شب کو پہلو میں وہ خوش جمال ہوتا ہے
تو بدر رشک سے گھٹ کر ہلال ہوتا ہے

بلا سے ہو گیا دشمن اگر سارا جہاں اپنا
رہے بس یا الٰہی مہرباں وہ مہرباں اپنا

برقِ جمالِ یار نے ہوش مرے اُڑا دیئے
آپے سے میں گزر گیا جلوۂ یار دیکھ کر

فراقِ شمع رو میں صبح کو دم ہم بھی توڑیں گے
ہمارے ساتھ رخصت تو بھی اے شمعِ سحر ہونا

قطعہ

رنگ عالم کا دیکھ کر فانی — آتشِ شوق پر پڑا پانی
ہاں کسی چیز میں قرار نہیں — ہاں بجز ایک ذاتِ یزدانی

مندرجۂ بالا اشعار کے الفاظ دیکھنے میں آسان اور معمولی ہیں۔ مگر مطالب کی طویل تشریح کے حامل ہیں۔ گویا سہل ممتنع کے بہترین نمونے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اسلوبِ بیان اتنا حسین و دل کش ہے کہ اشعار کی لطافت دل و جان سے خراجِ تحسین لے رہی ہے۔

افسوس ابھی اپنی تخلیقات کی داد اچھی طرح نہ پا سکے تھے کہ ۱۹۲۹ء میں یکایک مرضِ مہلک میں مبتلا ہو کر دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

آپ کی شاعرانہ زندگی پندرہ سولہ سال سے آگے نہ بڑھ سکی تھی، پھر بھی کافی ترقی کی۔ سچ ہے کہ شاعری علم و ادب کی ایک نہایت لطیف اور نازک صنف ہے۔ یہ قدرت کا فیضان اور فطرت کا الہام ہے۔ ان گنی چنی سطروں میں آغا سہسرامی کا عکس مکمل طور پر لینا ممکن نہیں ——— لیکن یہ مختصر مقالہ شاعر موصوف کی ایک ہلکی سی تصویر ضرور دکھاتا ہے۔

بقیہ

میں اُردو اَدب کا مطالعہ کر رہی ہوں

سوویٹ یونین کے مختلف اشاعت گھروں میں لاکھوں کاپیوں میں اردو کی کتابوں کا ترجمہ چھاپا جاتا ہے۔ یہ کتابیں بڑی مقبولیت حاصل کر لیتی ہیں۔ سوویت لوگوں نے پریم چند، کرشن چندر، عصمت چغتائی، احمد عباس، قاسمی کے ناولوں اور کہانیوں کو، بیدی اور منٹو کی کہانیوں کو، سجاد ظہیر کی یادداشتوں کو، علی سردار جعفری اور دوسرے شاعروں کے کلام کو بہت پسند کیا۔ بہت سے مصنفوں کی کتابیں نہ صرف روسی زبان میں بلکہ ازبیک، یوکرین، استونیائی، قزاخ، جارجیائی وغیرہ زبانوں میں ترجمہ کی جاتی ہیں۔ کلاسیکی شاعروں نے بھی بڑی مقبولیت حاصل کی ہے۔ غالب، میر، ذوق، اقبال جیسے نام سوویت یونین میں مشہور ہیں۔

آخر میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ ہم سوویت لوگ بڑی دلچسپی کے ساتھ بھارتی عوام کے ادب اور تہذیب کی ترقی پر، نوآبادیاتی نظام کے اثرات کو دور کرنے اور نئی زندگی تعمیر کرنے کی ان کی کوششوں پر نظر رکھتے ہیں۔ جہاں تک نئی زندگی تعمیر کرنے میں کامیابیوں کا تعلق ہے تو وہ بہت ہیں۔ میں پہلی بار ہندوستان سنہ ۱۹۵۸ء میں آئی تھی اور اب یہ کامیابیاں مجھے اچھی طرح سے دکھائی دیتی ہیں۔ اب میں جو پہنچنے کے لئے یہاں اردو زبان و ادب کو سیکھنے کے لئے آئی ہوں، اور اس لئے بہت خوش ہوں کہ مجھے ہندوستانی عوام کی زندگی سے گہری واقفیت حاصل کرنے کا موقع ملا ہے۔

مراسلات

کیا اُردو مشکل ہوتی جا رہی ہے؟

۸ دسمبر کے ہماری زبان کا اڈیٹوریل پڑھا۔ مجھے اس خیال سے بالکل اتفاق ہے کہ :-

"۔۔۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ آج اُردو زبان مشکل ہوتی جا رہی ہے اور بالکل فارسی معلوم ہوتی ہے۔ آج کی اُردو زبان پر انگریزی اور ہندی کا گہرا اثر ہے ۔۔۔ ۔۔۔ پریم چند کے اثر سے افسانے اور ناول کی زبان آسان اور عام فہم ہو گئی ہے۔ اس دور کے اچھے مضمون نگار حالی کے اسلوب سے متاثر ہیں جس میں سادگی نمایاں ہے۔"

لیکن "ہماری زبان" کے اسی شمارہ کا پہلا مضمون پڑھا جائے، تو اس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے :-

"راقم سطور کے کتب خانے میں ۲۲ × ۱۴ کے پیمانے پر ۱۲۹ ورق یعنی ۲۵۸ صفحات کی ایک قلمی بیاض متعدد علمی و مذہبی مسائل نیز نسخہ جات پر مشتمل محفوظ ہے۔"

اگر مضمون نگار اسی بات کو آسان زبان میں ادا کرنا چاہتے تو کیا اس طرح نہیں لکھ سکتے تھے کہ میرے کتب خانے میں اس سائز اور ان صفحوں کی ایک قلمی کتاب ہے، جس میں بہت سے علمی اور مذہبی مسئلوں پر لکھا گیا ہے۔ اس میں کچھ (یا بہت سے، جو صورت ہو) نسخے بھی درج ہیں۔ لیکن یہ عبارت تو پھر بھی غنیمت ہے۔ اسی صفحے کے تیسرے پیراگراف کی ابتدائی سطریں ملاحظہ ہوں:-

"بیاض اگرچہ سنین مندرجۂ بالا سے متعلق ہے مگر ضروری نہیں کہ اس کے مشمولات بھی اسی زمانے سے متعلق ہوں، کیونکہ تصانیف اور نقول کے وقت میں بُعد کا ہونا ممکنات سے ہے۔"

دوسرا پیراگراف بھی اس سے کچھ کم نہیں ہے۔ مضمون نگار صاحب لکھتے ہیں۔ "مولد بیاض کرسانی متذکرہ صدر درمیں کتابت کی تاریخ ۔۔۔ مرقوم ہے جس سے اخذ ہوتا ہے۔" ان لفظوں اور فقروں کو دیکھئے، جن کے نیچے لائن کھینچی گئی ہے اور فیصلہ کیجئے کہ کیا یہ زبان کسی طرح بھی موزوں ہے؟

اس مضمون میں مشکل لفظوں کی صرف یہی چند مثالیں نہیں ہیں جنھیں میں نے اوپر پیش کیا ہے بلکہ پورا مضمون اس طرح کے لفظوں سے بھرا پڑا ہے، جن کی جگہ بہت آسانی سے ایسے لفظ لکھے جا سکتے تھے جنھیں زیادہ سے زیادہ لوگ سمجھ سکیں۔ مثلاً "۔۔۔ کی اولاد قدیم الایام سے سکونت پذیر ہے" کے بجائے "۔۔۔ کی اولاد بہت عرصے سے وہاں رہتی ہے یا آباد ہے" یا "۔۔۔ ایسا ہی مترشح ہوتا ہے" کی جگہ "ایسا ہی ظاہر ہوتا ہے" یا "تاہم بہ معلومات مزید اگر یہی بزرگ منقولہ نظم کے مصنف ٹھہرتے ہیں" کے بجائے "تاہم اگر اور معلومات حاصل ہونے یا کرنے کے بعد بھی یہی بزرگ اس نظم کے مصنف ٹھہرتے ہیں۔"

ہماری زبان کے اسی اڈیٹوریل میں ایک جگہ یہ بھی لکھا گیا ہے کہ:

"ہم چاہتے ہیں کہ اُردو اور عام فہم ہو۔ اس کے لئے ہمیں علاقائی بولیوں کے الفاظ بھی لینے پڑیں گے اور ہندی کے ایسے الفاظ بھی جو سیاسی یا ملکی ضرورت کی وجہ سے عام طور پر سمجھے جانے لگے ہیں۔ پھر انگریزی کے وہ الفاظ بھی جو ہمارے دور کی ضروریات کا اظہار کرتے ہیں۔"

اس طرح کی باتیں پہلے بھی ہماری زبان میں بارہا لکھی گئی ہیں مگر محض لکھنا کافی نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ "ہماری زبان" کو اس کا عملی نمونہ بنایا جائے۔ میں جانتا ہوں کہ اس میں بہت سی مشکلیں اور دشواریاں ہیں، لیکن صحیح فائدہ اسی وقت پہنچے گا جب لکھنے والوں کے سامنے آسان زبان کا کوئی نمونہ ہو اور "ہماری زبان" کے لکھنے والوں کو بھی معلوم ہو کہ اس میں وہی چیزیں چھپیں گی جن کی نہ صرف زبان آسان ہو بلکہ لکھنے کا انداز بھی سہل اور واضح ہو۔

اوپر کا جو ٹکڑا میں نے نقل کیا ہے، اسی سلسلے میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ "اُردو زبان کے لئے اب یہ خطرہ نہیں ہے کہ وہ مشکل اور محدود ہو جائے گی۔" اس خیال سے مجھے پورا پورا اتفاق ہے، مگر مشکل یہ ہے کہ اُردو کے بہت سے ادیبوں کو اس سے اتفاق نہیں ہے۔ ابھی کچھ عرصہ ہوا دلی کی ایک ادبی انجمن نے آسان زبان کے بارے میں ایک سمپوزیم کا سلسلہ شروع کیا تھا جو کئی نشستوں میں ختم ہوا۔ اس میں مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ بعض اچھے ادیبوں نے یہ خطرہ ظاہر کیا تھا کہ اگر اُردو کو آسان کیا گیا تو ہندی میں مل کر ختم ہو جائے گی۔ چند لوگوں نے یہ بھی کہا کہ اردو کو آسان کرنے کی باتیں حکومت کی خوشامد میں کی جا رہی ہیں۔ جب تک اُردو ادیبوں کی یہ ذہنیت باقی رہے گی اردو کو آسان بنانا بہت مشکل ہے۔

(عبداللطیف اعظمی)

یہ شعر سعادت نظیر کا ہے

ہماری زبان میں یہ شعر چھپا ہے:

تری ذرا سی توجہ اگر ہو شامل حال
تو بے رُخی بھی گوارا مجھے جہان کی ہے

وہ ماہنامہ بیسویں صدی ماہ اگست ۱۹۶۲ء صفحہ ۹ پر یوں شائع ہوا ہے:

تری ذرا سی توجہ اگر ہو شاملِ حال ، تو بے رُخی بھی گوارا مجھے زمانے کی

اور یہ شعر سعادت نظیر صاحب کا ہے۔ (مرزا افتخار بیگ)

"دل کش جے پور"

الطاف احمد صاحب خیری کا مضمون "دل کش جے پور" جو آپ کے شمارہ مورخہ ۸ر اکتوبر ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا ہے میری نظر سے بھی گزرا۔ خیری صاحب نے جس دل کش انداز سے جے پور شہر کی دل کشی کا نقشہ کھینچا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ مضمون اچھا ہی نہیں بلکہ معلوماتی بھی ہے اور واقعات پر مبنی۔

خیری صاحب سے بصد معذرت میں لکھنے پر مجبور ہوں کہ اس شہر کو حسین تر بنانے اور اس میں چار چاند لگانے میں جس شخصیت کا ہاتھ ہے اس کا انھوں نے کہیں ذکر نہیں کیا۔ افسوس کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں۔ ان کا نام سر مرزا محمد اسمٰعیل تھا جو کئی سال تک سابقہ ریاست جے پور کے وزیر اعلیٰ رہ چکے تھے۔ یہاں اُن کے نام پر ایک سڑک بھی ہے جسے "مرزا اسمٰعیل روڈ" کہتے ہیں۔ یہ سڑک شہر کی فصیل کے دامن میں ہے جو سانگانیر دروازہ سے شروع ہو کر پرانے محلہ خاص (جو اب گورنمنٹ ہوسٹل ہے) کے آگے خاصہ کوٹھی تک جاتی ہے۔ اس سڑک پر جو بازار واقع ہے وہ ہندوستان کے کسی بھی جدید شہر کے بازار سے مقابلہ کر سکتا ہے۔

جہاں تک شہر جے پور کی خوبصورتی کا تعلق ہے اس کے لئے یہ کافی ہے کہ اسے دنیا کا دوسرا سب سے خوب صورت شہر مانا گیا ہے۔ میکس لیرنر (Max Lerner) ایک مشہور جرنلسٹ اور سیّاح لکھتا ہے:۔

"میں نے جے پور دیکھ لیا اور اب میں مر سکتا ہوں"

اسی طرح سر ہیو کیسن (Sir Hugh Casson) کے خیال میں دنیا میں سب سے زیادہ خوبصورت شہر تین ہیں پیپنگ (Peiping) جے پور اور وینس (Venice) اس کے علاوہ شہر جے پور اپنی دل کشی کے باعث کئی سال سے فلمی پروڈیوسروں اور ڈائرکٹروں کی بھی دل چسپی کا مرکز بنا ہوا ہے یہاں پر لاتعداد فلموں کی شوٹنگ ہو چکی ہے جس میں خاص خاص یہ ہیں "ہمایوں" "سمدھ ملکہ" "جھانسی کی رانی" "مغل اعظم" اور "بڑا آدمی" وغیرہ۔

جہاں یہ حقیقت ہے وہاں ایک اور حقیقت بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ جے پور شہر کی گلیاں اور چھوٹے راستے بہت ہی گندے ہیں۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی کہ ایسے خوبصورت شہر کی گلیاں اتنی گندی ہو سکتی ہیں۔ یہ گندگی جے پور شہر کی خوبصورتی پر ایک بد نما داغ ہے مگر بقول شاعر۔ ع

"یہ گھر کی بات ہے گھر میں رہے تو اچھا ہے"

زہرہ جمال
قیصر ہند ہوٹل، مرزا اسمٰعیل روڈ جے پور

روشنی کی پرچھائیں

اپنے دو ہاتھ کا طاقت ....

.... گوشت کا دکان ....

.... کے او میدوار ....

نوشاد کا موسیقی

یہ تو چار ہی مثالیں ہوئیں، کلکتہ کی سڑکوں پر گھومنے والے کو ایسی صدہا مثالیں ملیں گی۔ یہ تو خیر عوام کی زبان ہے، آئیے آپ کو مولانا آزاد کالج کی لائبریری کی سیر کراؤں۔ یہ ایک کونے میں کارڈس کا صندوق رکھا ہے۔ ایک دراز میں اردو کتابوں کے کارڈس ہیں۔ اسے کھینچئے؛ پہلے ہی آپ چونک پڑیں گے؛

عبدالمجید دریا آبادی

اور کارڈس اُلٹتے جائیے؛

سیرت نبوی اور مستشرک (مستشرقین)

جامعل لوغت (جامع اللغات)

Mushtarka Zaban (مشترکہ زبان)

وغیرہ وغیرہ۔

اب آپ ہی بتائیے کہ میں بے ساختہ "روشنی کی پرچھائیں" نہیں کہوں تو کیا کہوں۔ جہاں ایک سے ایک اُردو ادارے موجود ہوں وہاں کی سڑکوں پر اس طرح اُردو کا قتل عام کیا قابل برداشت ہے؟ جس کالج میں ایک سے ایک عالم فاضل اور صاحب تصنیف و تصنیفات پروفیسر اردو کے موجود ہوں اُس کالج کی لائبریری میں اُردو کا یہ قتل؟

(اقبال کاوش)

علی گڑھ تاریخ ادب اُردو کی ایک تصحیح

کچھ عرصہ پہلے علی گڑھ تاریخ ادب اُردو کی پہلی جلد شائع ہوئی ہے اس تاریخ کے صفحہ (۵) پر حسب ذیل صراحت کی گئی ہے:۔

"پنجاب میں اُردو، کی اشاعت کے بعد دکن میں اُردو، مدراس میں اُردو، میسور میں اُردو، بہار میں اُردو ادب جیسی کتابیں شائع ہوئی ہیں"

یہ صراحت حقیقت کے خلاف ہے، کیونکہ دکن میں اُردو، پنجاب میں اُردو کے پہلے شائع ہوئی ہے، دکن میں اُردو کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا ہے۔

(نصیرالدین ہاشمی)

ادبی دنیا

ہندوستان میں ادبی دنیا کے خریدار اپنا سالانہ چندہ (چار روپے دس آنے) جناب ایس۔ ایس۔ عثمان اینڈ کمپنی گھڑی والے چاندنی چوک دہلی کو بھیج کر ہمیں ایک کارڈ (ادبی دنیا۔ ۹۹ دی مال لاہور) لکھ دیں پرچہ جاری ہو جائے گا۔

(وزیر آغا ایڈیٹر ادبی دنیا)

امریکہ میں اُردو

امریکہ کی وس کان سن یونیورسٹی میں اُردو کا تعلیمی کام مستقل بنیاد پر شروع کر دیا گیا ہے۔ اگلے سال کے لئے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ریڈر اُردو دہلی یونیورسٹی کو وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے امریکہ آنے کی دعوت دی گئی ہے اس سے پہلے انھیں حکومت برطانیہ کی جانب سے لندن یونیورسٹی میں تحقیقی کام کرنے کے لئے فیلوشپ ملا تھا۔ لیکن نئی پیش کش کی وجہ سے وہ جنوری کے آخری ہفتے میں بجائے لندن کے امریکہ کے لئے روانہ ہوں گے۔

اُردو لائبریری چکردھرپور کا دوسرا سالانہ جلسہ

اُردو لائبریری چکردھرپور کا دوسرا سالانہ جلسہ ۲۰ دسمبر ۶۲ء کو زیر صدارت جی۔ کے سنہا۔ بی۔ ڈی۔ او۔ چکردھرپور منعقد ہوا۔ جلسہ کا افتتاح قومی ترانہ سے کیا گیا صدر جلسہ نے اپنی صدارتی تقریر میں ملک کی موجودہ ہنگامی حالت میں لائبریری کی ذمہ داری پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد دو تجویزیں باتفاق آرا پاس ہوئیں۔ پہلی تجویز میں ہندستان پر چین کے حملے کی مذمت کی گئی۔ اور دوسری تجویز میں اُردو دوستوں سے اپیل کی گئی کہ وہ ملک کے دفاعی سرگرمیوں میں پورا پورا حصہ لیں۔

دنیا سے جہالت دور کرنے کی مہم

نئی دہلی ۱۸ دسمبر گذشتہ ۱۹۶۳ء کے دوران ایشیائی علاقے کے ملکوں اور ہندستان کو یونسکو کی طرف سے دی جانے والی امداد میں اساتذہ کی تربیت، تعلیمی منصوبہ بندی اور سائنسی تعلیم کی ترقی کی سرسس شامل ہیں۔

وزارت تعلیمات کے سکریٹری اور ہندستانی قومی کمیشن برائے یونسکو کے سکریٹری جنرل مسٹر جی۔ این کرپال نے کل اخباری نمائندہ کو بتایا کہ یونسکو کا بارہواں اجلاس ابھی حال میں پیرس میں ختم ہوا ہے۔ اس میں اس بات پر بھی غور کیا گیا ہے کہ لڑکیوں اور عورتوں کو بھی بہتر تعلیمی مواقع مہیا کئے جائیں۔ کانفرنس نے ایشیائی اور عرب ممالک میں امکانی ذرائع کی ترقی کے پروگرام میں اس کو بھی شامل کر لیا ہے۔ تعلیمی منصوبہ بنانے اور منتظمین کی تربیت، اسکول بنانے کی تربیت دینے کے لئے یونسکو براہ راست امداد دے گا۔ یہ امداد وہ اپنے نئی دہلی کے علاقائی مرکز سے دے گا۔ اسکے دوسرے مرکز منیلا، بینکاک اور بانڈنگ میں ہیں مختلف علیموں کے تعلیمی اعداد و شمار معلوم کرنے میں بھی یونسکو تعاون کرے گا۔

مسٹر کرپال پیرس کی کانفرنس کی روداد پر تبصرہ کر رہے تھے جس میں ہندستان کی نمائندگی راجکماری امرت کور کر رہی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ اگلے دو سالوں کے لئے یونسکو نے سب سے زیادہ ترجیح سائنسی اور ثقافتی تعلیم پر دی ہے یونسکو نے اپنے ۲ کروڑ ۱۰ لاکھ ڈالر کے بجٹ میں ۹۰ لاکھ ڈالر اقوام متحدہ کے ٹیکنیکل امداد کے خصوصی فنڈ سے تعلیمی سرگرمیوں کے لئے منظور کی ہے۔

انہوں نے بتایا کہ یونسکو نے ماہرین کی ایک بین اقوامی کمیٹی بنانے کا فیصلہ کیا ہے جو دنیا بھر میں ناخواندگی کے خلاف مہم چلائے گی اور ناخواندگی کا سدباب کرے گی اس مہم کی پہلی منزل میں یونسکو کے ممبر ملکوں (ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ کے ممالک) کے ۵۰ کروڑ بالغوں کو تعلیم دے گی۔

عالمی تعلیمی مہم کے علاوہ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ممالک میں سائنسی تحقیقات کی تربیت قومی پیمانوں پر دی جائے گی۔ اگر ترکی اور بلغاریہ میں کامیابی ہوئی تو اس رقم کو یونسکو تعلیمی اور سائنسی ترقی پر صرف کرے گا۔

معاصر۔

"مشکل" اُردو

وزیر داخلہ ہند شری لال بہادر شاستری کی اُردو کے لئے ایک ہمدردانہ تقریر پارلیمنٹ میں۔

"کبھی کبھی میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اُردو فارسی سے بھی زیادہ مشکل ہوتی جا رہی ہے ... میں خود بھی تھوڑی سی اُردو جانتا ہوں لیکن اُردو کی نئی چھپنے والی چیزوں کو سمجھنا میرے لئے مشکل ہوتا ہے اور اسی طرح اُردو والوں کی پوزیشن ہندی کے سلسلے میں اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔"

لیکن خدا معلوم وہ کون سی نئی اُردو کتابیں تھیں جو وزیر صاحب کے مطالعہ میں آئیں اور وہ انھیں مشکل اور فارسی آمیز نظر آئیں صورت حال تو اس وقت اس کے برعکس ہی ہو رہی تھی۔ یعنی عموماً اردو والوں نے تو آزادی کے بعد سے اپنا طرز ہی بدل دیا ہے اور بلا ضرورت ہندی کے الفاظ ٹھونس ٹھونس کر اپنی اُردو کو ہندی آمیز بنا ڈالا ہے ۔۔۔ یہ صحیح ہے کہ اہل سیاست کو اکثر اپنی تقریر میں دو فریقوں کے درمیان توازن قایم رکھنے اور اپنی غیر جانبداری ظاہر کرنے کو اپنے کلام میں بہت کچھ لوچ پیدا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن جدید اردو پر اتنا خلاف واقعہ الزام رکھ دینا تو ان حدود سے صاف تجاوز کر جانا ہے۔

(صدق جدید)

مریخ کی چیزیں

خود کار فضائی اسٹیشن مریخ ۱ سیارہ مریخ کی جانب اپنے سفر پر گامزن ہے۔ ۲ نومبر سے ۲۵ دسمبر کے عرصہ میں مریخ ۱ سے رسل و رسائل کا تعلق قائم ہوا۔ ریڈیو کے ذریعہ یہ تعلق باقاعدگی سے کام کر رہا ہے۔

دور پیمائشی طریقوں سے اسٹیشن کا جو جائزہ لیا گیا اس سے واضح ہے کہ اسٹیشن کے آلات کے تمام آلے قاعدے سے کام کر رہے ہیں۔

مریخ ۱ کی پرواز کے دوران اسٹیشن سے سائنسی معلومات کا بہت سا مسالہ موصول ہوا ہے۔ سورج کے برقی ذرات کی شعاعوں سے متعلق موجودہ معلومات میں اضافہ ہوا ہے۔ کائناتی شعاعوں کی شدت اور بیرونی خلا میں مقناطیسی قوت اور نو دریافت شہابی ذرات کے بارے میں بھی کچھ نئی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ معلومات برابر موصول ہو رہی ہیں اور زمین پر ان کا مطالعہ کیا جا رہا ہے۔

خوب بچاؤ
خوب اُگاؤ
بھارت کو
مضبوط بناؤ

بقیہ: قصہ پرتھی راج کا

اور ورد آفرین و تحسین کا پا دسے، قاعدہ قلیہ ہے جب آرزو دل
دیکھی جاتی ہے ہر ایک اپنے عزیز سے رونمائی پاتی ہے...[1]

سبب تالیف کے بعد پرتھی راج کی یہ کہانی بھی روایتی انداز سے شروع ہوتی ہے:-

"پورب کے شہروں میں سے کسی شہر میں ایک راجہ تھا بلند قدر والا مقدار فلک شکوہ، عالی وقار، امیر پیوستہ اس کے شہر کا یوں گوہر تاباں ہموار اور بازار اس کا ٹوپا ہوا بازار، قلعہ اس کا بس محکم، اور خندق اس کی دریائے تمام، فصیل آسمان سے ہمسر، دروازے اس کے مضبوط اور فولاد کے، برابر نام اس مہاراجہ کا راجہ جیسنگھ قوم چہاووت تھا، خلائق پروری، عدل گستری میں دن رات مشغول رہتا، دریا سخاوت و بخشش کا اس کے دست گوہر بار سے بہتا... افضال خدا سے دس فرزند سعادت مند، خوب صورت، خوش سیرت رکھتا تھا ہر ایک بہادری میں رستم دہر، سخاوت میں حاتم، قصر عدالت میں نوشیرواں اور حسن میں غلمان — بارے بعنایت جل شانہ کی قدرت کاملہ سے اور ایک دختر ماہ پیکر پیدا ہوئی... اور نام اس کا پدم سین رکھا[2]۔"

اس پری پیکر پدم سین اور مہاراج پرتھی راج کے معاشقہ کی داستان رنگین بیان ہوئی ہے، اس قصے کا تانا بانا نیم تاریخی واقعات اور تخیلات کے تاروں سے بنا گیا ہے، قصے کے ساتھ مختلف ذیلی کہانیاں مختصر سہی، لپٹی ہوئی ملتی ہیں، پرتھی راج کے اس قصے میں اس کی محبوبہ سنجوگتا نہیں، بلکہ پدم سین عرف پدماوت ہے، بلاد پورب دیس کے راجہ جیسنگھ کی پری وش بیٹی ہے، اس میں بھی پدم سین پرتھی راج پر غائبانہ عاشق ہوتی ہے، مگر پری وش کو پرتھی راج کے حسن و جمال، جاہ و جلال اور شجاعت اور درایت کی رنگین کہانیاں طوطا سناتا ہے، جو پرتھی راج کے پنجرے سے اڑ جاتا ہے اور پدماوت کے بے پناہ حسن پر ریجھ کر اس کے ہاتھ پر آ بیٹھتا ہے۔ اسی طوطے کے ذریعہ پدم سین اپنے دل کے دکھ درد کا حال پرتھی راج کو لکھ بھیجتی ہے اور اپنے نادیدہ اور ناپسندیدہ منگیتر راجہ کماؤں سے چھڑانے کے لئے پرتھی راج کو کال کے منہ میں بلواتی ہے۔ ——

پرتھی راج کو جب پدم سین کے عشق کا حال معلوم ہوتا ہے تو وہ خود آتش عشق میں جلنے لگتا ہے، ہونا بھی ایسا ہی چاہئے تھا، پدم سین کو چھڑانے اور دلی لے جانے کے لئے پرتھی راج کال منہ آتا ہے۔ پدم سین اس سے ملتی ہے، اور پدم سین کو گھوڑے پر بٹھا کر سنبھل یعنی دلی کی طرف لے اڑتا ہے، راجہ کماؤں کو اس سانحہ کی خبر ملتی ہے، عاشق نامراد غصے میں کانپنے لگتا ہے، راجہ جیسنگھ اور کماؤں کی فوجیں پرتھی راج کا تعاقب کرتی ہیں، لیکن راجا کماؤں پسپا ہوتا ہے، ذلیل ہو کر فرار ہوتا ہے، مگر اس جنگ کے بعد بھی پرتھی راج کی مصیبتیں ختم نہیں ہوتی ہیں، چنڈیل قوم کا راجہ پرمال، پرتھی راج کا دشمن ہو جاتا ہے، پرتھی راج کے گھائل سپاہیوں پر حملہ کر کے ہلاک کر دیتا ہے، اس کے بعد پرتھی راج اور راجہ پرمال کی خوفناک جنگ کی لرزہ خیز داستان شروع ہوتی ہے، اس جنگ میں چنڈیل قوم ہار جاتی ہے۔ اس کے ہزاروں سورما فنا کے گھاٹ اتار دئے جاتے ہیں چنڈیل قوم کے دو پہلوان جنیل الہن اور ردل جو سگے بھائی ہوتے ہیں پرتھی راج کی فوجوں کو روک نہیں سکتے، جے چند کی فوج کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔ الہن مارا جاتا ہے۔ دوسرا بھائی ردل جنگ سے توبہ کر کے سادھو بن جاتا ہے، چنڈیل قوم کے ساتھ گھائل سپاہیوں کی جنگ اور افسانوی بہادری، اور لونڈی عورت کی شجاعت کے کارنامے ایسے ہیں، جو قابل قبول نہیں ہیں۔ ——

قصہ پرتھی راج میں ہر ہر قدم پر حیرت انگیز واردات اور طلسمی فضا ذہن کا احاطہ کرتی جاتی ہے، جنگ کی ہولناکیوں اور فوق فطرت کردار کی ناقابل یقین بہادری، اور آبدار تلواروں کی جھنکار کبھی رگ و پے میں جوش اور کبھی خوف کا احساس پیدا کرتی ہے۔ چنڈیل قوم کے راجہ پرمال کی فریب کاریوں، ہٹ اور عاقلانہ جذباتی فیصلوں سے پوری قوم کی تباہی کا حال بھی دلچسپ ڈھنگ سے بیان ہوا ہے۔ اس دور کی سیاسی چپقلش اور سماجی اور معاشرتی زندگی کے مبہم خطوط بھی ملتے ہیں، راجاؤں کی پھوٹ اور ذاتی مخاصمت عظیم ہندوستانی سلطنت کی تباہی اور زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوتی تھی، ہندوستانی تلواروں کے تصادم کی جھنکار میں ہندوستان کی بربادی کے طوفان کی دھمک سنائی دے رہی تھی، مولف میر عباس علی نے جنگ کی نہایت عمدہ تصویر اتاری ہے۔ واقعات اور منظر نگاری میں گویا اسے کمال حاصل تھا۔ پرتھی راج اور شہاب الدین غوری کی جنگ، پرتھی راج کی جیت اور شہاب الدین غوری کی شکست کی کہانی میں خوب صورت رنگوں کی آمیزش سے دلچسپی اور زور پیدا کیا ہے۔ ——

"پرتھی راج خوشی سے چلا آتا تھا کہ دشمن سخت نے راہ میں سر دکھایا یعنی بادشاہ شہاب الدین غازی نے سامنے اپنی فوج سے فرمایا کہ یہ (اس) کافر نے بہت رنج دئے ہاں خبردار جانے نہ پاوے اور جیتا پکڑ آوے یہ سن کر وزیر نے آداب بجا لا عرض کیا اے خداوند روئے زمین اس نے ایسے کام کئے ہیں کہ بشر کی طاقت اس کا پکڑا جانا جیتا محال ہے... ... غرض تلوار چلی، ایسی لڑائی خونریز ہوئی کہ زمین ہل گئی اور خاک خون میں مل گئی۔ مردوں کے ڈھیر پڑے، کشتوں کے پشتے لگے، جلاد فلک نے دانت میں انگلی پکڑی، اور ملک الموت کی طبیعت جانوں کے نکالتے نکالتے بگڑ گئی... ایسا جنگ عظیم (ایسی جنگ) ہوا (ہوئی)

[1] ملاحظہ ہو دیباچہ ورق ۵، ق ۱۰، [2] ایضاً ورق ۲۰، ق ۱ ن،

"گرد دونوں طرف لشکر خون میں ڈوبا، پرتھی راج نے گھوڑے کی باگ اٹھائی اور بادشاہ کے گلے میں کمان ڈال کر پکڑ لایا[·]۔"

یہاں تاریخی واقعہ کی صرف ایک جھلک ہے، درحقیقت یہ بھاکا کے مصنف کے ذہن کی اپج زیادہ ہے، لڑائی میں پرتھی راج کے جانبازوں کی ہلاکت اور پھر ان کے دوبارہ زندہ کئے جانے کا حال "خوق فطرت" عقل کی سرحد میں انسانی ذہن کو لے جاتا ہے، پرتھی راج کے دوست راست گیاس، بھنی سنگھ، نرسنگھ، نڈر وغیرہ تھے، ان کو اب راج چندر کے بردائی آب حیات پلاکر یم راج سے چھین لیتے ہیں۔

"کب راج چندر بردائی نے آب حیات اون مارے ہوؤں پر چھڑکا خدا کی قدرت سے سب زندہ ہوئے اور حیات دوبارہ پائے[·]۔"

ایسے انوکھے اور غیر المعقول واقعات سے قصہ بھرا پڑا ہوا ہے، اس لئے لطف دے جاتا ہے۔ یہ قصہ انیسویں صدی کی نثر نگاری کا ایک نمونہ ہے، لہٰذا اس کی افادیت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا قصے کے خالق نے اپنے ہیرو یعنی پرتھی راج کو ہر طرح سے مکمل انسان کے روپ میں پیش کیا ہے، وہ جس قدر جری اور نڈر تھا اسی طرح سخی اور فیاض بھی، وہ بڑا عالی ظرف تھا، اس نے 'احسان' کو فراموش کرنا نہیں سیکھا تھا۔ رائے سنجم نے میدان کارزار میں اس کی جان گرجنوں سے بچائی تھی، رائے سنجم کے 'احسان' کے بوجھ تلے ہمیشہ دبا رہا۔ اور اس نے رائے سنجم کے بیٹے کو سرفراز کیا اور اعلیٰ مرتبہ بخشا۔

پرتھی راج کا یہ قصہ شہاب الدین غوری کے ہاتھوں شکست یا اس کی ہلاکت پر ختم نہیں ہوتا ہے، بلکہ دلی کو اس کی فاتحانہ واپسی پر ختم ہوتا ہے، اس واپسی کا نقشہ بھی بڑے سلیقے سے کھینچا گیا ہے۔

"— اور آپ منزلیں طے کر کے ساتھ نصرت و فتح کے شاہ جہان آباد داخل ہو چکا۔ برہمنوں کو بلوا کر ہاتھی گھوڑے، دوشالے، شال، دوشالے، مشرو کمخواب زر و جواہر، روپیہ اور اشرفیاں بانٹ دیا تھیں، اور کھانے اقسام کے کھلوائے، ایسی خیرات کی فقیروں بیچے غنی ہو گئے، اور بے سہارہ اور مفلس دھنی بنے اور سور سامنت جو مہاراج کے ساتھ مرے تھے اور بعد مرنے کے آب حیات سے زندہ ہوئے تھے، ان سبھوں کو موافق جانفشانیاں ان کی خلعت اور زر و جواہر سے سرفراز کیا اور ہاتھی گھوڑے عطا فرمایا، پھر مہاراج بیٹے ساتھ خوشی کے محل تشریف لے گیا[·]۔"

قصہ پرتھی راج کا، یہیں ختم ہو جاتا ہے، اور اس کے خاتمہ پر مؤلف نے لکھا ہے۔

"تمام ہوا قصہ پرتھی راج کا پانچویں ذی حجہ کی ۱۲۵۵ ہجری میں فرمائش سے نواب محمد خان بہادر جنگ کے ہاتھ سے میر عباس علی کے[·]۔"

ایشیاٹک سوسائٹی کلکتے کے کتب خانہ کا یہ مخطوطہ ۲۳۰ اوراق پر پھیلا ہوا خوب صورت نستعلیق میں لکھا ہوا ہے، لیکن اس نیم تاریخی قصے کی زبان میں ناہمواری اور ناپختگی پائی جاتی ہے، اور جابجا غلطیاں تانیث و تذکیر کی ملتی ہیں، جنگ، فتح اور ایسے بہت سے الفاظ جن پر کوئی اختلاف نہیں، بے دھڑک تذکیر لکھے گئے ہیں۔ میر عباس علی "نے" کا بھی استعمال نہیں جانتے، ان خامیوں کی وجہ سے عبارت بھونڈی اور طرز نگارش بھدی لگتی ہے۔ مگر ان تمام کمزوریوں اور عیوب سے قطع نظر انیسویں صدی کی یہ ایک مفید کتاب ہے، کیونکہ اس قسم کی نثری داستانوں کی بنیاد پر اردو نثر کی موجودہ عالی شان عمارت تعمیر ہوئی تھی۔

میر عباس علی نے کتاب کے خاتمہ کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ پرتھی راج نے حضرت معین الدین چشتیؒ سے بھی جنگ کی تھی، لیکن جنگ میں اسے شکست ہوئی تھی اور بہتیرے راجپوت سورما مارے گئے تھے، لہٰذا پرتھی راج خواجہ چشتیؒ کے قدم پر جا گرا تھا، معافی چاہی تھی، اور ان کی دعاؤں کی بدولت پرتھی راج کو دلی کی عظیم الشان سلطنت ملی تھی،...

غالباً میر عباس کا یہ اضافہ ہے۔ —

---

[۱] دیکھئے ق، ن، ۵۲ ورق، [۲] ۵۲ ورق ۲۲۹، ق، ن،
[۳] مخطوطہ ۲۲۸ ورق، قلمی نسخہ۔

[·] دیکھئے ۲۳۰ ورق، ج، نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری کا۔

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) پبلشر نذیر حسن پرنٹر ظہیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا۔